آئس کریم

طاہر جاوید مغل

زندگی کے ہموار راستوں پر چلتے چلتے اچانک ہی قدم لڑکھڑا جاتے ہیں... ڈگمگا جاتے ہیں... اور انسان اس طرح گرتا ہے کہ پھر سنبھلنا مشکل تر ہو جاتا ہے... معمولی سی بے احتیاطی ایک بڑے حادثے کا پیش خیمہ بن جاتی ہے... پرسکون سائبان تلے رہنے والے خاندان کو پیش آنے والے دردناک سانحے کی روداد... ایک ہی رات میں ان سب کی زندگی تہ و بالا ہوگئی تھی...

محبت کی چنگاری جو انتقام کی آگ میں بدل چکی تھی......

لڑکی خوب صورت تھی۔ سرخ و سپید رنگت جس میں ہلکے سے گندمی رنگ کا امتزاج بھی تھا۔ بالکل سیاہ آنکھیں اور آنکھوں کے ''ہم رنگ'' لمبے ریشمی بال جو اس کے ایک گلابی کان کو تقریباً ڈھانپ رہے تھے۔ اس کی ستواں ناک میں ایک ننھی سی چمک دار ''کوکی'' تھی۔ وہ گرمیوں کے ہلکے پھلکے پھول دار لباس میں تھی۔ جدید تراش کی لمبی قمیص اس کی جسمانی موزونیت کو نمایاں کرتی تھی۔ اس کے کانوں میں بالیاں اور کلائیوں میں زرد رنگ کی چوڑیاں تھیں۔ وہ سادگی

اور کشش کا ایک دلکش نمونہ نظر آتی تھی۔ اسی مہینے اس کی شادی تھی۔ وہ اپنے العمرازمانوں کے ساتھ زندگی کا نیا سفر شروع کرنے والی تھی۔ کوئی بھی سفر شروع کرنے کے لیے انسان کا زندہ ہونا ضروری ہوتا ہے...... اور وہ زندہ نہیں تھی۔ اسے مرے ہوئے تین گھنٹے سے زائد وقت ہو چکا تھا۔

میں نے گہری سانس لے کر ایک بار پھر اسے سرتاپا دیکھا۔ وہ کمرے کے فرش پر آڑی ترچھی پڑی تھی۔ چند ٹوٹی ہوئی چوڑیاں اس کے سر کی طرف بکھری ہوئی تھیں۔ پرنٹڈ لان کی قمیص سامنے سے چاک تھی اور اس کے زیریں لباس کی بے ترتیبی کو بھی ظاہر کر رہی تھی۔ اس کے دودھیا جسم پر گہری چوٹوں اور خراشوں کے تازہ نشان موجود تھے۔ بہر حال موت کا سبب سر پر لگنے والی گہری چوٹ تھی بلکہ یہ ایک نہیں دو چوٹیں تھیں جو کسی کند آلے سے لگائی گئی تھیں۔ مکمل تفصیل تو پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ہی سامنے آتی۔ تاہم بادی النظر میں یہ مجرمانہ حملے اور قتل کا کیس لگتا تھا۔

متوسط آبادی کا یہ ایک ''دومنزلہ'' گھر تھا۔ ہم دوسری منزل پر موجود تھے۔ اس کمرے سے باہر گھر کے دیگر حصوں میں کہرام مچا ہوا تھا۔ مقتولہ کی والدہ اور دیگر عزیزوں کی آہ و بکا سے در و دیوار گونج رہے تھے۔ یہ رات قریباً ساڑھے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ مجھے لڑکی کا نام کشف معلوم ہوا تھا۔ اس کے والد جمیل صاحب ایک پرائیویٹ فرم میں بطور اکاؤنٹنٹ جاب کرتے تھے۔

وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہے تھے۔ میرے کندھے سے لگ کر مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ ''انسپکٹر صاحب! میں برباد ہو گیا۔ میری دنیا اندھیر ہو گئی۔ میری کشف لال جوڑا پہننے سے پہلے لال رنگ میں نہا گئی۔ دیکھیں اس معصوم کو کس بُری طرح نوچا کھسوٹا گیا ہے۔ ہائے...... میں نے تو اسے کبھی کانٹا چبھنے کی تکلیف نہیں ہونے دی تھی۔ دیکھیں کتنی تکلیف سے جان دی ہے میری کشف نے۔ یااللہ مجھے بھی موت دے دے...... مجھ سے یہ سب کچھ دیکھا نہیں جاتا...... یااللہ...... یااللہ۔'' وہ بلکتے ہوئے اور اپنی رانیں پیٹتے ہوئے باہر نکل گئے۔

میں نے سفید چادر دوبارہ مقتولہ کے جسم پر ڈال دی اور ایک بار پھر اپنے اے ایس آئی کے ساتھ موقعِ واردات کا تفصیلی جائزہ لینے لگا۔

☆☆☆

پوسٹ مارٹم رپورٹ میں یہ بات واضح ہو گئی کہ مقتولہ کے سر پر کسی کند آلے سے دو شدید ضربیں لگائی گئیں۔ ان ضربوں کی وجہ سے کھوپڑی کی درمیان والی ہڈی ٹوٹ گئی اور کچھ ہی دیر میں کشف کی موت واقع ہو گئی۔ یہ کند آلہ ممکنہ طور پر کوئی ہتھوڑا یا ہتھوڑی ہو سکتی تھی۔ مقتولہ کے بالائی اور زیریں جسم پر ایسے واضح نشانات موجود تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے مکمل طور پر بے لباس کرنے اور زیادتی کا نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کوشش میں ناکامی کے بعد اسے شدید ضربات لگا کر موقع پر ہی قتل کر دیا گیا ہے۔

مقتولہ کے ادھیڑ عمر والد جمیل صاحب شلوار قمیص میں ملبوس میرے سامنے بیٹھے تھے اور میں ان سے سوال جواب کر رہا تھا۔ میں مقتولہ کی والدہ شمیم بیگم سے بھی بات کرنا چاہتا تھا مگر وہ اکلوتی بچی کے دردناک قتل کے شدید صدمے کے زیرِ اثر اسپتال پہنچ چکی تھیں۔ میں نے کہا۔ ''جمیل صاحب جیسا کہ آپ کے بیان سے پتا چلا ہے کہ واردات کے وقت آپ کی بیٹی کشف گھر میں اکیلی تھی۔ فقط اس کا تین سالہ بھائی فرحان گھر میں تھا۔ اور وہ بھی دوسرے کمرے میں سو رہا تھا۔ آپ میاں بیوی افطاری میں شرکت کے لیے کشف کے ہونے والے سسرال گئے ہوئے تھے۔''

''دراصل ہمیں لڑکے کو عیدی وغیرہ دینے جانا تھا۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہم افطاری بھی ان کے ساتھ کر لیں۔ عید سے سترہ اٹھارہ روز بعد شادی تھی۔ رواج کے مطابق کشف تو ساتھ نہیں جا سکتی تھی۔ مجبوراً ہم چھوٹے فرحان کو اس کے پاس چھوڑ گئے اور اس بدنصیب کو تسلی دے گئے کہ جلدی آنے کی کوشش کریں گے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے جمیل صاحب کی آواز پھر بھرا گئی اور ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''پرسوں آپ شام چھ بجے کے قریب اپنی آلٹو کار پر اقبال ٹاؤن سے روانہ ہوئے، اپنے سمبندھیوں کے گھر واپڈا ٹاؤن پہنچنے کے لیے۔ آپ کی واپسی دس بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ ان چار گھنٹوں کے دوران میں آپ نے دو دفعہ بیٹی کو فون کیا۔ ایک مرتبہ افطاری کے بعد قریباً ساڑھے سات بجے، دوسری مرتبہ قریباً آٹھ بجے۔ دونوں مرتبہ کشف خیریت سے تھی۔ دوسری مرتبہ اس نے آپ کو یہ بھی بتایا کہ چھوٹے فرحان کو پھر بخار محسوس ہو رہا ہے، اس نے اسے دوا کھلا کر سلا دیا ہے۔''

جمیل صاحب نے اثبات میں سر ہلا کر میری بات کی تصدیق کی۔

''آٹھ بجے کے بعد آپ نے اور آپ کی بیگم نے... کم از کم چار دفعہ کشف کو کال کی جو ریسیو نہیں ہو سکی۔ آپ نے

ہی سمجھا کہ وہ بھی سوگئی ہے۔ بہرحال آپ میاں بیوی مزید تاخیر کیے بغیر واپس روانہ ہوگئے؟''

''جی ہاں۔'' جمیل صاحب نے رُندھے ہوئے گلے کے ساتھ کہا۔

''مطلب یہ کہ آٹھ اور دس بجے کے درمیان کوئی آپ کے گھر میں داخل ہوا اور اس کے نتیجے میں کشف کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا۔ موقع واردات سے جو شہادتیں ملی ہیں، ان سے ہم اب تک کوئی نتیجہ نہیں نکال سکے۔ آپ ابھی تک کسی پر اپنے شک کا اظہار بھی نہیں کر سکے ہیں۔ نہ ہی کشف کی فرینڈ دریاب کوئی خاص بات بتا سکی ہے۔'' جمیل صاحب نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔

دریاب، کشف کی کالج کی دوست تھی اور اس نے وقوعہ کے بعد خود بتایا تھا کہ وہ آٹھ بجے کے قریب کشف سے ملنے ان کے گھر آئی۔ یہ ایک سرپرائز وزٹ تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ کشف کے امی ابو گھر میں نہیں ہیں۔ وہ اس کے لیے آرٹی فیشل جیولری کا ایک سیٹ اور آئس کریم لے کر آئی تھی۔ وہ آدھ پون گھنٹا کشف کے ساتھ بیٹھنا چاہتی تھی مگر پھر اسی دوران میں اس کے گھر سے فون آگیا کہ اس کی والدہ کی طبیعت خراب ہے۔ ان کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے لیے گاڑی کی ضرورت تھی اور دریاب چونکہ گاڑی پر ہی آئی تھی اس لیے فوراً واپس چلی گئی۔ اس کی گاڑی گرے رنگ کی مہران تھی۔

پرسوں واردات کے چار پانچ گھنٹے بعد دریاب نے جو طویل بیان دیا تھا، اس کے مطابق... وہ صرف آٹھ دس منٹ ہی کشف کے پاس رک پائی تھی۔ افطاری کے فوراً بعد اس کی والدہ کو معدے کا شدید درد شروع ہوگیا تھا اور انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانا ضروری تھا۔ دریاب کے بیان کے مطابق جب وہ آئی تو کال بیل پر خود کشف نے ہی دروازہ کھولا۔ وہ اسے دیکھ کر از حد حیران اور خوش ہوئی۔ تب تک فرحان سو چکا تھا۔ ان دونوں نے عید اور شادی کی آمد کا ذکر کیا۔ کشف کے رویے سے ہرگز کسی طرح کی پریشانی یا دکھ کی کیفیت ظاہر نہیں ہوتی تھی۔

میں اور میرا اے ایس آئی اردگرد کے لوگوں کے بیان بھی قلم بند کر چکے تھے۔ آٹھ اور دس بجے کے درمیان کسی نے بھی جمیل صاحب کے گھر میں کسی کی آمدورفت نہیں دیکھی تھی۔ فقط ایک شخص نے اتنی بات بتائی تھی کہ افطاری کے آدھ پون گھنٹے بعد اس نے جمیل صاحب کے گھر کے سامنے ایک گرے رنگ کی مہران کار کھڑی دیکھی تھی، جو کچھ

ہی دیر بعد وہاں سے چلی گئی تھی۔ یہ شخص ایک جنرل اسٹور چلاتا تھا۔ جنرل اسٹور، جمیل صاحب کے گھر کے سامنے ہی واقع تھا اور گھر سے اس کا فاصلہ پینتیس چالیس میٹر سے زیادہ نہیں تھا۔ جمیل صاحب کا گھر چونکہ ایک بند گلی (سڑک) کے آخری سرے کے قریب تھا۔ لہٰذا یہاں غیر متعلقہ لوگوں کی آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ جو یہاں آتا تھا اسی راستے سے واپس بھی جاتا تھا۔ لہٰذا جب گڑے مہران واپس گئی تو جنرل اسٹور کے مالک شیخ ایاز نے اسے دیکھا تھا۔

جمیل صاحب سے سوال جواب کرنے کے بعد جب میں اُن کے گھر سے واپس لوٹ رہا تھا تو میں نے جنرل اسٹور سے تھوڑا آگے جا کر ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا کہا۔ میری نگاہ ایک کوٹھی نما گھر کی بالکونی کی طرف گئی تھی۔ وہاں مجھے ایک سی سی ٹی وی کیمرے کی جھلک نظر آئی تھی۔ یہ کوٹھی نما گھر جمیل صاحب کے دومنزلہ گھر سے پندرہ بیس گھر چھوڑ کر واقع تھا اور یہاں سی سی ٹی وی کیمرا موجود تھا۔ اگر یہ کیمرا ورک کر رہا تھا تو ایک اچھی پیش رفت ہو چکی تھی۔

☆☆☆

مڈل اور اپر کلاس کی رہائشی آبادیوں میں سی سی ٹی وی کیمرے تو کہیں کہیں موجود ہوتے ہیں، تاہم کسی واردات کے موقع پر ان کیمروں کے مالکان پولیس سے تعاون کرنے سے کنی کتراتے ہیں۔ بہر حال ہم تھوڑی سی کوشش کے بعد مذکورہ کیمرے کی سہولت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے......اور یہ کامیابی خاصی کارآمد ثابت ہوئی۔

ہم پولیس اسٹیشن میں موجود تھے۔ چار پانچ گھنٹوں میں ہم نے کیمرے کی مطلوبہ ریکارڈنگ کو بڑی اچھی طرح دیکھ اور پرکھ لیا۔ اس ریکارڈنگ کے مطابق مقتولہ کی دوست دریاب کے بیان کی بھی مکمل تصدیق ہوتی تھی۔ دریاب کی گاڑی آٹھ بجنے سے تین چار منٹ پہلے کیمرے کے سامنے سے گزری اور پھر تقریباً پندرہ منٹ بعد قدرے تیز رفتاری سے واپس چلی گئی۔ اس گاڑی کے جانے کے تقریباً دس منٹ بعد ایک اور ایسی ''انٹری'' ہوئی جس نے پہلے جمیل صاحب کو بُری طرح چونکایا، پھر ہمیں بھی۔ یہ انٹری موٹر بائیک پر سوار ایک نوجوان لڑکے کی تھی۔ جمیل صاحب کے اشارے پر وڈیو کو وہاں روک دیا گیا۔ وہ زرد چہرے اور ہانپتے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''یہ...... ث ثاقب ہے...... میرا بھتیجا...... لل...... لیکن...... یہ کیوں آیا......؟ یہ دیکھی ہے۔''

ہم نے ریکارڈنگ کے اس حصے کو دو تین بار دیکھا۔ جمیل صاحب نے لرزاں آواز میں یقین سے کہا کہ یہ ثاقب ہی ہے۔

کم و بیش ایک گھنٹے میں میرے اہلکار ثاقب کو اس کے گھر سے اٹھا کر تھانے لے آئے۔ ثاقب کے والد اور بھائی وغیرہ بھی ساتھ آئے تھے، تاہم انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر باہر بٹھا دیا گیا۔ جمیل صاحب بھی دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ ہم نے اکیلے میں ثاقب سے پوچھ گچھ شروع کی۔ اس کی عمر چوبیس کے لگ بھگ تھی۔ کلین شیوڈ تھا۔ تاہم شلوار قمیص اور گول ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ اس نے بتایا کہ یہاں آنے سے پہلے وہ تراویح کی نماز پڑھ رہا تھا۔ پولیس والے اسے زبردستی اٹھا لائے ہیں۔ وہ ایک قبول صورت پڑھا لکھا لڑکا نظر آتا تھا لیکن فی الوقت گھبرایا ہوا تھا۔ اس کی آمد سے پہلے ہی جمیل صاحب دبے لفظوں میں بتا چکے تھے کہ سال ڈیڑھ سال پہلے ثاقب کے گھر والوں نے کشف کے لیے ثاقب کا رشتہ ڈالا تھا۔ ثاقب شاید کشف کو پسند بھی کرتا تھا مگر اس کی والدہ چونکہ سخت مزاج تھی اور ثاقب خود بھی برسرِ روزگار نہیں تھا لہٰذا یہ بات آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ جمیل صاحب کی باتوں سے یہ اشارہ ملا تھا کہ شاید ماضی میں کشف نے بھی ثاقب کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہو لیکن پھر اس نے خود کو بدل لیا تھا اور دونوں گھرانوں کا میل جول بھی نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ اب وہ اپنی بدلی ہوئی زندگی سے مطمئن تھی بلکہ خوش تھی۔ اس نے والدین کی مرضی کو مقدم جانا تھا۔

اشارے واضح طور پر ثاقب کی طرف جا رہے تھے۔ مزید، وہ جس طرح حواس باختہ نظر آتا تھا، ہمارے شک کو ہوا مل رہی تھی۔ میں نے مجبوراً پولیس والوں کا مخصوص لب ولہجہ اختیار کیا اور اسے سر کے بالوں سے کھینچتے ہوئے کہا۔ ''جو کچھ بہت ذلیل وخوار ہو کر بتاؤ گے، وہ سیدھی طرح بتا دو گے تو بہتر رہے گا۔ تم نے کیا کیا ہے اپنی اس بدقسمت کزن کے ساتھ؟''

وہ تھر تھر کانپتے ہوئے بولا۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا جی، آپ کیوں مجھ پر شک کر رہے ہیں۔ کشف تو دور کی بات ہے، مجھے تو تایا جمیل سے ملے بھی چار پانچ ماہ ہو چکے تھے۔''

''تم تایا کے گھر آخری بار کب گئے؟''

''مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ شاید وہ کرائے والے گھر میں رہتے تھے جیون مندر کی طرف...... اس وقت گیا تھا۔''

میں نے زور کا تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ وہ کرسی سمیت الٹ گیا۔ اہلکاروں نے اسے اٹھا کر سیدھا کیا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو چکا تھا اور پورا جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''شاید تمہیں معلوم نہیں ہفتے کی رات آٹھ بج کر بیس منٹ پر جب تم تایا جمیل والی گلی میں داخل ہوئے تو ایک سی سی ٹی وی کیمرے نے تمہاری منحوس آمد کو دیکھ لیا تھا اور پھر قریباً بیس منٹ اس گھر میں رکنے کے بعد اور اپنی درندگی کے ثبوت دینے کے بعد جب تم وہاں سے نکلے تو بھی کیمرے نے تمہیں رجسٹر کر لیا تھا۔''

میرے اے ایس آئی نے ریکارڈنگ چلا کر اسے دکھائی۔ اس کے پاس اب کوئی ''ایکسکیوز'' باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اس کا حال اب یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ ''انسپکٹر صاحب...... مم...... میں تایا کے گھر گیا ضرور تھا...... لیکن......'' وہ اس سے آگے کچھ بول نہ سکا۔ اس کے ہونٹ بے ساختہ تھرا کر رہ گئے تھے۔

میں نے کہا۔ ''تمہارے اس ''لیکن'' کے بعد جھوٹ ہی جھوٹ ہے اسی لیے تمہاری قوتِ گویائی جواب دے رہی ہے۔ جو کچھ ہوا ہے، وہ تمہیں میں بتا دیتا ہوں۔'' ذرا توقف کے بعد میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات جاری رکھی۔ ''یہ کوئی ایسی پیچیدہ کتھی نہیں ہے۔ تم اپنی کزن کشف پر نظر رکھتے تھے...... اور یہ بُری نظر ہی تھی۔ ماں باپ کے فیصلے سے اتفاق کرتے ہوئے جب کشف نے تم سے مکمل طور پر منہ پھیر لیا تو تمہارے اندر غم و غصہ پیدا ہوا۔ تم اسے دوبارہ اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر ایسا ہو نہیں سکا۔ اب تمہاری تمام امیدیں دم توڑ چکی تھیں کیونکہ چند دن بعد کشف کی شادی ہونے والی تھی، ہفتے کے روز تمہیں کسی طرح معلوم ہو گیا کہ کشف کے گھر والے اس کے ہونے والے سسرال جا رہے ہیں اور وہ گھر میں اکیلی ہو گی۔ تم اپنی ہوس کے گھوڑے پر سوار ہو کر اس کے گھر پہنچے۔ اسے ورغلانے کی کوشش کی...... اور جب ناکام ہوئے تو وحشت کے عالم میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیا......''

''نہیں سر، بالکل نہیں...... میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ مم...... میں یہ مانتا ہوں کہ اس سے محبت کرتا تھا اور شاید...... آج بھی کرتا ہوں۔ میں ایک آخری بار اس سے ملنے ضرور گیا تھا مگر میں نے کیا کچھ نہیں......'' وہ آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔

''اچھا...... تو پھر ہماری معلومات میں اضافہ فرماؤ۔ ہمیں بتاؤ کہ وہاں کیا ہوا؟''

''میں سچ کہتا ہوں جی۔ میں اس سے مل ہی نہیں پایا...... مم...... میں نے تین چار منٹ تک ڈور بیل بجائی۔ ایک دو بار دستک بھی دی مگر دروازہ نہیں کھلا۔ میں ٹہلتا ہوا سامنے والی اسنوکر شاپ پر چلا گیا۔ لڑکے کھیل رہے تھے، میں کھڑا انہیں دیکھتا رہا تب دوبارہ دروازے پر پہنچا۔ کچھ دیر تک بیل دیتا رہا پھر واپس چلا آیا۔ مجھے یہی لگا کہ شاید کسی کھڑکی میں سے کشف نے مجھے دیکھ لیا ہے اور دروازے تک نہیں آئی۔ ابھی واپس گھر پہنچا ہی تھا کہ اس کی موت کی دل ہلا دینے والی خبر پہنچ گئی۔''

میں نے ثاقب کو اپنے ایک سخت گیر حوالدار کے حوالے کر دیا۔ یہ کرامت نامی حوالدار پولیس کے روایتی ہتھکنڈوں سے پوری طرح واقف تھا بلکہ دس سالہ تجربہ بھی رکھتا تھا۔ اس نے اپنے طریقے سے ''پوچھ گچھ'' کی اور قریباً ایک گھنٹے بعد ثاقب نے اعتراف کر لیا کہ یہ بھیانک غلطی اسی سے ہوئی ہے۔ وہ کشف سے صرف ملنے کے لیے آیا تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ وہ بالکل اکیلی ہے، چھوٹا بھائی بھی دوسرے کمرے میں سو رہا ہے تو اس کے اندر کا شیطان جاگ اٹھا۔ اپنی مطلب براری میں ناکام ہو کر اس نے کشف کے سر پر لوہے کے ہاون دستے سے ضربات لگائیں اور اسے بے ہوش چھوڑ کر فرار ہو گیا۔

پڑھنے والے سمجھیں گے کہ شاید یہ کیس حل ہو گیا لیکن ہم پولیس والے جانتے ہیں کہ مار پیٹ کے نتیجے میں ملزمان اس طرح کے جو بیانات دیتے ہیں، ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی۔ اپنے وکیل کی ہدایت کے مطابق ملزم عدالت میں پیش ہوتے ہی اپنے بیان سے مکر جاتا ہے۔ وہاں بات ٹھوس زمینی شہادتوں اور مضبوط گواہوں پر آ کر ٹھہرتی ہے۔

میں ملزم ثاقب کے اعترافی بیان کو مکمل طور پر رد کر رہا تھا اور نہ ہی قبول کر رہا تھا۔ اس کی وجہ سی سی ٹی وی کی ایک اور ''شہادت'' بھی تھی۔ اس دوسری شہادت نے بھی مقتولہ کے والد جمیل صاحب کو متاثر کیا تھا اور ساتھ ساتھ ہمیں بھی۔

یہ شہادت سی سی ٹی وی ریکارڈنگ پر آٹھ بج کر پچپن منٹ پر نمودار ہوئی تھی اور یہ ایک سکندر نامی شخص کی صورت میں تھی، سکندر کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ ایک خوش پوش شخص تھا۔ وہ کریم کلر کی شلوار قمیص میں ملبوس لمبے ڈگ بھرتا ہوا، ریکارڈنگ میں نمودار ہوا تو جمیل صاحب ایک بار پھر

بے طرح چونکے تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ پانچ چھ ماہ قبل وہ جین مندر کے جس علاقے میں کرائے کے مکان میں رہتے تھے، سکندر اسی علاقے کا رہنے والا ہے۔ وہ اسی محلے میں پراپرٹی کا کام کرتا تھا بلکہ وہاں جمیل صاحب کو کرائے کا مکان بھی اسی سکندر کے توسط سے ملا تھا۔ جمیل صاحب کی باتوں سے انکشاف ہوا کہ سکندر کی شہرت کچھ اچھی نہیں تھی۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کسی حد تک ''بدمعاشی'' میں بھی قدم رکھتا تھا۔ جمیل صاحب نے مجھے بتایا کہ ایک کرائے دار کی حیثیت سے انہوں نے کبھی بھی اپنے مالک مکان کو پریشان نہیں کیا، مگر یہ سکندر حیلے بہانوں سے بار بار ان کے دروازے پر دستک دیتا تھا۔ ایک دو بار کشف نے بھی شکایت کی کہ وہ اسے گھورتا ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوا تھا جب ایک موقع پر جمیل صاحب نے سکندر کے ساتھ سخت لہجے میں بات کی۔ بہرحال جمیل صاحب کا خیال تھا کہ وہ جب تک اس گھر میں رہے، اس سکندر کی طرف سے انہیں اور ان کے اہلِ خانہ کو پریشانی ہی رہی۔

اگلے ہی روز صبح سویرے میری بھیجی ہوئی پارٹی لمبے چوڑے سکندر کو پکڑ کر پولیس اسٹیشن لے آئی۔ اس کی صورت دیکھ کر ہی مجھے پتا چل گیا کہ وہ نشہ بھی کرتا ہے...... غالباً چاروں معروف شرعی عیب اس میں موجود تھے۔ اندر سے شاید وہ ڈرا ہوا ہو مگر باہر سے پُرسکون اور بے خوف نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کشف کے قتل والے واقعے سے آگاہ تھا اور بہت حیرانی ظاہر کر رہا تھا کہ اسے اس سلسلے میں طلب کیوں کیا گیا ہے؟

میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''جناب سکندر صاحب! آپ کو طلب اس لیے کیا گیا ہے کہ جمیل صاحب آج کل جس گلی میں رہتے ہیں، وہاں ایک گھر میں کلوز سرکٹ کیمرا نصب ہے اور واردات کی رات اتفاق سے وہ کیمرا کام بھی کر رہا تھا۔''

سکندر کے گندمی چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ اس نے اپنے چمکیلے سیاہ گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں گھمائیں اور بولا۔ ''اب بات کچھ کچھ سمجھ میں آرہی ہے...... پھر بھی...... مجھے لگ یہی رہا ہے کہ میاں جمیل نے میرے بارے میں کچھ الٹا سیدھا بول دیا ہے...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، ہفتے کی رات میں اس سڑک پر گیا ضرور تھا مگر کسی بھی طرح کسی بُری نیت سے نہیں۔ آپ جس طرح چاہیں تصدیق کر سکتے ہیں۔ شاید آپ کو معلوم نہیں اور میاں جمیل صاحب کو بھی معلوم نہیں کہ رمضان شریف سے پہلے ان کے محلے میں جو نئے محلے دار، پروڈیوسر چوہدری الیاس صاحب آئے ہیں وہ میرے پرانے دوست ہیں۔ ان کے ساتھ ایک لمبے عرصے سے جان پہچان ہے۔ میں ان سے ہی ملنے گیا تھا۔ مجھے تو اس بات کا پتا بھی واردات کے بعد ہی چلا کہ میاں جمیل بھی اسی اسٹریٹ میں رہتے ہیں۔''

''تم نے تھانے آتے ہوئے راستے میں اے ایس آئی ارحم سے جھوٹ کیوں بولا کہ ہفتے کی رات تم لاہور میں ہی نہیں تھے؟''

سکندر کے چہرے پر پھر رنگ سا آکر گزر گیا۔ غیر مستحکم لہجے میں وہ بولا۔ ''سچی بات یہی ہے جی کہ اپنے بلاوے پر میں ڈر گیا تھا۔ مجھے سمجھ آرہی تھی کہ کسی وجہ سے مجھے اس قتل کے معاملے میں ملوث کیا جارہا ہے...... مم...... مجھے کیمرے والی بات کا پتا نہیں تھا۔ میرا خیال یہی تھا کہ شاید میاں جمیل یا اُن کے گھر والوں میں سے کسی نے مجھے اس اسٹریٹ میں دیکھا ہے اور میاں جمیل نے پرانی رنجش کی وجہ سے میرا نام لے لیا ہے۔''

آدھے گھنٹے کے اندر ہی اس پروڈیوسر چوہدری الیاس کو بلا لیا گیا۔ سکندر نے انکشاف کیا تھا کہ وہ فلم پروڈیوسر ہے۔ تاہم ملاقات کے بعد وہ نہ پروڈیوسر لگا نہ چوہدری لگا اور نہ ہی کسی کام کا لگا۔ ہمارے خیال کے برعکس اس کی عمر بھی اٹھائیس تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ پکا سا رنگ اور بھدے نقوش۔ چار پانچ منٹ کی گفتگو میں ہی یہ بات کھل گئی کہ چوہدری الیاس ان لوگوں میں سے ہے جو فلم بنانے کے لیے نہیں بلکہ صرف اپنے وقت کو رنگین بنانے کے لیے پروڈیوسرز کا روپ دھارتے ہیں۔ ان کے پاس روپیا ہوتا ہے، یہ لاہور کے کسی فلم اسٹوڈیو میں ایک دفتر کرائے پر لے کر ایک آدھ ملازم رکھ لیتے ہیں اور اسٹوڈیو کی راہداریوں اور باغیچوں میں اُڑتی پھرتی تتلیوں کو دبوچنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ (الیاس نے بھی کچھ عرصہ پہلے ایک چھوٹا پلازا بیچا تھا اور جیبوں میں نوٹ ٹھونسے پھرتا تھا)

اس الیاس نامی شخص نے اپنے دوست سکندر کے بیان کی تصدیق کی اور بتایا کہ ہفتے کی رات وہ نو بجے سے قریباً دس بجے تک اس کے نئے گھر میں رہا اور وہ دونوں باہمی دلچسپی کے امور پر گفتگو کرتے رہے۔ میری چند سخت جھاڑیں کھانے کے بعد بھی وہ اپنے بیان پر قائم رہا۔ بہرحال اسی دوران میں ایک ایسا ثبوت ہمارے ہاتھ لگ گیا جس سے یہ کیس تقریباً تقریباً حل ہوگیا۔

شومئی قسمت اس برائے نام پروڈیوسر کا موبائل فون

اس کی جیب میں ہی تھا۔ میرے پڑھے لکھے نوجوان اے ایس آئی ارحم نے اس موبائل کا ''پوسٹ مارٹم'' کیا تو اسے پتا چلا کہ فون میں ''کال ریکارڈنگ'' کی ایپلی کیشن بھی لگی ہوئی ہے۔ ریکارڈ شدہ کالز میں سات آٹھ روز پہلے کی ایک کال بڑی دھانسو ثابت ہوئی۔ الیاس کی بھول تھی یا پھر حماقت تھی کہ وہ ابھی تک اس کال کو ''ڈیلیٹ'' نہیں کر پایا تھا۔ جمعرات کی شب الیاس نے یہ کال اپنے ہم نوالہ و پیالہ سکندر کو کی تھی۔ گفتگو کچھ اس طرح تھی۔

''یار! ڈر ہی لگ رہا ہے پنگے سے...... اتھری رن (عورت) ہے۔ آسانی سے کنٹرول نہیں ہوگی۔''

الیاس نے کہا۔ ''اوئے چیتے، ڈرے گا تو کیا کرے گا؟ تو نے سنا نہیں کہ ڈر کے آگے جیت ہوتی ہے۔''

''اور جیت کے آگے پنگا بھی تو ہو سکتا ہے بلکہ جیت کے دوران میں بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے گھر والوں میں سے کوئی ٹپک پڑا تو پھر؟''

''نہیں ٹپکے گا، یہ میرا دل کہہ رہا ہے...... میرا پُرزور مشورہ تو یہی ہے چیتے نکال لے اپنے دل کی حسرت۔ بڑی ریشمی چیز ہے اور پھسل رہی ہے تیرے ہتھ سے...... یہ موقع پھر نہیں ملنے والا۔''

''تو پھر تو بھی کچھ ساتھ دے میرا۔''

''تیری مت ماری گئی ہے۔ کل تیری بھابی اپنی ماں کے گھر سے آ نئی ہے۔ عید تک تو وہ ایک منٹ کے لیے بھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑنے والی۔''

''تو پھر عید کے بعد کا پروگرام رکھ لیتے ہیں۔ کیا کہتے ہیں کہ صبر کا پھل میٹھا۔''

''زیادہ میٹھا تو پھر کڑوا۔''

اسی دوران میں کسی عورت کے بولنے کی آواز آئی۔ غالباً یہ الیاس کی بیوی تھی۔ اس نے کال ختم کر دی۔

میں کوئی روایتی تھانیدار نہیں تھا پر اس کال کے بعد میرے لیے دل و دماغ کو ٹھنڈا رکھنا ممکن نہیں رہا۔ دونوں دوست ابھی تک جرم سے انکار کر رہے تھے۔ ان کی حیثیت اور مرتبے کی پروا کیے بغیر میں نے حوالدار کرامت سے کہا کہ وہ اپنی کرامت دکھائے۔ وہ دونوں دھمکیوں پر اتر آئے اور پھر کچھ ہی دیر بعد ایک بڑا وکیل ان کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔ ایڈووکیٹ آفتاب کی مجھ سے بھی کچھ جان پہچان تھی۔ اس نے علیحدگی میں دونوں دوستوں سے طویل گفتگو کی پھر میرے پاس آ گیا۔ کہنے لگا۔ ''انسپکٹر شاہ جہاں! جرم کی صرف پلاننگ پر تو سزا نہیں ہو سکتی ناں؟''

''تم کیسی بات کر رہے ہو؟'' میں نے حیرانی سے کہا۔ ''یہاں پلاننگ ہی نہیں، جرم بھی ہوا ہے۔''

''نہیں صرف پلاننگ ہوئی ہے اور اگر یہ آڈیو ریکارڈنگ عدالت تک پہنچتی ہے تو وہاں ہم بڑی آسانی سے اس ریکارڈنگ کو بھی ''فیک'' ثابت کر سکتے ہیں۔''

''یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ تم اس پلاننگ کو صرف پلاننگ کیوں کہہ رہے ہو؟''

جواب میں ایڈووکیٹ آفتاب نے ''آف دی ریکارڈ'' رازداری کے لہجے میں جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ یہ تھا...... ریکارڈ ہونے والی گفتگو کشف کے بارے میں نہیں تھی۔ یہ سونیا نامی ایک اور خاتون تھی۔ لاہور میں ہی رہتی تھی۔ اس کا شوہر دو سال سے ملائیشیا میں تھا۔ سکندر کے ساتھ سونیا کا معاشقہ ڈیڑھ دو سال سے چل رہا تھا۔ وہ اس کی محبت کے جال میں پھنسی ہوئی تھی مگر شادی شدہ تھی اس لیے ایک حد سے آگے بڑھنا نہیں چاہتی تھی۔ دوسری طرف سکندر جیسے لوگ اپنے رویّوں میں مادر پدر آزاد ہوتے ہیں۔ سکندر کو معلوم تھا کہ دو ڈھائی ماہ تک سونیا اپنے خاوند کے پاس ملائیشیا جا رہی ہے۔ اس کا ارادہ یہی تھا کہ سونیا کے اُڑن چھو ہونے سے قبل کسی طرح اس سے اپنے تعلق کا خراج وصول کر لے۔ تاہم اسے یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں عین موقع پر وہ پھر انکار نہ کر دے۔ فوری طور پر سکندر کا یہ مذموم ارادہ یوں پورا نہ ہو سکا تھا کہ عید سے چند دن پہلے ہی سونیا اپنے ننھیال کوئٹہ چلی گئی تھی اور اسے پندرہ بیس روز بعد واپس آنا تھا۔

☆☆☆

عیدالفطر کی تین چار چھٹیوں میں بھی میرا ذہن اس کیس میں اُلجھا رہا۔ فرش پر بے سدھ پڑی نرم و نازک کشف کا سراپا میری نگاہوں میں گھومتا رہا۔ اس کے والدین اس کے دولہا کی ''عیدی'' لے کر گئے ہوئے تھے اور وہ دل میں سیکڑوں ارمان لیے راہی عدم ہو چکی تھی۔ جاتے جاتے وہ اپنے مجرم کو ڈھونڈنے کا سارا بوجھ قانون کے کندھوں پر ڈال گئی تھی۔

میں نے اور میرے عملے نے دو تین اور سمتوں میں بھی تفتیش کی تھی مگر تفتیش کا اصل رخ ابھی تک دو افراد کی طرف ہی تھا۔ ایک غنڈا صفت سکندر اور دوسرا کشف کا چچازاد ثاقب۔ ثاقب ابھی تک جسمانی ریمانڈ پر تھا اور حسب توقع وہ عدالت میں اپنے اعترافی بیان سے انکاری ہو گیا تھا۔ اس کا یہی کہنا تھا کہ وہ کشف سے ملنے ضرور گیا تھا

مگر اس کی آمد پر کشف نے دروازہ ہی نہیں کھولا تھا۔
دوسری طرف سکندر بھی زیرِ تفتیش تھا مگر اسے گرفتار نہیں کیا گیا تھا۔ ندامت کے عالم میں اس کا کہنا بھی یہی تھا کہ جو ریکارڈڈ گفتگو پکڑی گئی ہے، وہ کشف کے بارے میں نہیں سونیا کے بارے میں تھی۔ میں اپنے طور پر سونیا کے معاملات کی تصدیق تو کر چکا تھا لیکن یہ بات وثوق سے کیسے کہی جا سکتی تھی کہ وہ ریکارڈڈ گفتگو سونیا کے متعلق ہی تھی۔
ویسے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی اور جرم کا سراغ لگا رہے ہوتے ہیں اور کسی ایسے جرم کا یا جرم کی پلاننگ کا کھوج مل جاتا ہے جس کی توقع بھی نہیں کی ہوتی۔
عید کے بعد پہلے روز کی ڈیوٹی پر ہی مجھے یہ پتا چلا کہ مقتولہ کشف کی قریبی سہیلی دریاب لاہور میں نہیں ہے۔ دراصل میں نے اس سے ثاقب اور کشف کے تعلقات کے بارے میں مزید جاننے کے لیے فون کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنے گھر والوں سمیت ڈی جی خان چلی گئی ہے (جب تفتیش جاری ہو تو کیس سے تعلق رکھنے والے کسی قریبی فرد کا اچانک اوجھل ہو جانا، اسے مشکوک بنا دیتا ہے۔ دریاب بھی بغیر اطلاع دیے اوجھل ہو گئی تھی) دریاب کے حوالے سے ایک اور بات بھی، کسی وقت مجھے اُلجھن میں مبتلا کرتی تھی۔ ایک تفتیشی افسر کی حیثیت سے میں نے جب بھی اس سے سوال جواب کیے وہ بے حد گم صم نظر آئی، میرے دس فقروں کے جواب میں بس ایک آدھ فقرہ ہی بولا۔ اس کی آنکھوں کے اندر جیسے مسلسل کوئی دکھ کروٹیں لیتا تھا۔ اس کی اس کیفیت کو قریبی فرینڈ کی المناک جدائی پر بھی محمول کیا جا سکتا تھا...... مگر کسی وقت یہ کیفیت کچھ جدا بھی لگتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ شک بھی ہوتا تھا کہ وہ کوئی سکون بخش دوا کھاتی ہے یا کسی طرح کا ہلکا پھلکا نشہ کرتی ہے۔
کوشش کر کے میں نے دریاب کا فون نمبر حاصل کیا اور فون پر ہی اس سے ثاقب اور کشف کے بارے میں کچھ ضروری باتیں پوچھیں۔
...... وقت گزر رہا تھا اور کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ ایک مضبوط کیس کے بغیر چالان پیش کرنا بیکار تھا۔ اب مقتولہ کا چچا زاد ثاقب ضمانت پر تھا مگر اہم پیش رفت ہونے پر کسی بھی وقت اس کی ضمانت منسوخ ہو سکتی تھی۔ دوسرا مشتبہ شخص سکندر بھی ابھی تک یہ بات ثابت کرنے میں کامیاب تھا کہ اس کی جو آڈیو ریکارڈنگ پکڑی گئی ہے، وہ اس دوسری خاتون کے حوالے سے تھی اور وہ صرف زبانی کلامی باتیں تھیں۔ مزید یہ کہ واردات کی شام وہ اپنے دوست "چوہدری الیاس" کے گھر تک محدود رہا تھا۔
وقت گزر رہا تھا۔ کسی وقت تو یوں لگنے لگتا تھا کہ شاید یہ کیس سرد خانے میں ہی چلا جائے۔ ہم تینوں مشتبہ افراد یعنی ثاقب، دریاب اور سکندر کے بیانات میں ابھی تک کوئی کجی نہیں ڈھونڈ پائے تھے۔ لواحقین کی بے احتیاطی کی وجہ سے موقع واردات سے فنگر پرنٹس یا کوئی اور اہم شہادت حاصل نہیں ہو پائی تھی۔ مجھے مایوسی محسوس ہوتی تو نگاہوں کے سامنے، فرش پر آڑی ترچھی پڑی کشف کی لاش آ جاتی۔ وہ مجھ سے بہ زبان خاموشی پوچھتی ......کیا یہ میرے مرنے کی عمر تھی؟
کشف کی سہیلی دریاب ڈی جی خان سے واپس آ چکی تھی۔ ایک روز میں نے پھر اس سے سوال جواب کیے۔ اس پوچھ گچھ کے لیے میں نے اس کے گھر واقع "لاہور صدر" جانا مناسب سمجھا۔ میں سادہ لباس میں گیا تھا۔ دریاب کی والدہ کی موجودگی میں، میں نے دریاب سے اس شام کی ساری تفصیلات پوچھیں جب وہ اپنی سہیلی کو سرپرائز دینے کے لیے اس کے گھر پہنچی تھی۔ دریاب نے بتایا کہ وہ کتنے بجے نکلی، کہاں رکی اور کب پہنچی وغیرہ وغیرہ۔
اچانک...... بالکل اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ دریاب نے ایک مقام پر جھوٹ بولا ہے...... غلط بیانی کی ہے۔ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟
دریاب کے گھر سے واپس آ کر بھی یہی بات میرے ذہن میں گردش کرتی رہی۔ میرے اندر ایک وجدان سا پیدا ہو رہا تھا۔ اگلے روز صبح سویرے میں نے اپنے اے ایس آئی ارحم کو تین اہلکاروں کے ساتھ بھیجا اور وہ دریاب کو پولیس اسٹیشن لے آئے۔ دریاب کی والدہ اور ایک ماموں بھی ساتھ آئے تھے۔ وہ اسی گاڑی پر تھے جس پر دریاب چند دن پہلے سوار ہو کر کشف سے ملنے گئی تھی۔ اس چھوٹی گاڑی کے معائنے پر میرے اس اندازے کی تصدیق ہوئی کہ اس میں "اے سی" وغیرہ نہیں ہے۔ میرے اس اچانک بلاوے پر دریاب کے ماموں اور والدہ سخت جز بز تھے۔ میرا رویہ دیکھ کر اس کے ماموں نے میری پیٹی اتروانے کی "ہر دلعزیز" دھمکی بھی دے ڈالی۔ لیکن میں رسک لینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس سلسلے میں، میں نے ہیڈ آفس سے دو کہنہ مشق لیڈی اہلکاروں کو بھی بلا لیا تھا۔ میں نے پہلے دریاب سے زبانی پوچھ گچھ کی پھر اسے لیڈی اہلکاروں کے حوالے کر دیا۔
دریاب زیادہ سخت جان ثابت نہیں ہوئی۔ غالباً چند طمانچے کھانے کے بعد ہی اس کا خول ٹوٹ گیا اور اس نے

کچھ ایسی باتیں کہہ دیں جن کے بعد اس کے پاس واپسی کا راستہ نہ رہا۔ بے شک وہ ایک مضبوط لڑکی تھی۔ ایتھلیٹ اور ہاکی کی کھلاڑی بھی رہی تھی مگر تھی تو ایک لڑکی ہی۔ اس نے اعتراف کرلیا کہ چوبیسویں رمضان کی شام کشف کے گھر میں داخل ہونے والی اور اُسے موت کے گھاٹ اتارنے والی وہ خود ہی تھی۔ (دریاب کا یہ اعتراف، ثاقب والے اعتراف سے بالکل مختلف تھا۔ اس میں سچائی جھلک رہی تھی۔ وہ سچائی جو بے حد تلخ تھی اور حیرت انگیز بھی)

مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ بظاہر ہوا میں معلق یہ کیس صرف ایک نکتے کی وجہ سے اتنی جلدی اختتام کو پہنچ جائے گا۔ وہ نکتہ جو واردات کی شام، دریاب کی اقبال ٹاؤن آمد کے حوالے سے سامنے آیا تھا۔ اگلے دس بارہ گھنٹوں میں بھی کچھ واضح ہوگیا، کسی بھی قتل کیس میں سب سے اہم بات وجۂ قتل ہوتی ہے۔ دریاب نے کشف کو مارا تو کیوں مارا؟ اس کا جواب تھا رقابت۔ طویل پوچھ گچھ کے دوران میں یہ انکشاف ہوا کہ مقتولہ کشف کی شادی جس شاہ رخ نامی لڑکے سے ہو رہی تھی، وہ اسکول کالج کے دور سے ہی دریاب کا محبوب تھا پھر ان دونوں میں دوری پیدا ہوئی۔ دریاب اپنے رویّوں کے اعتبار سے بڑی حد تک پُراسرار اور انتہا پسند تھی۔ بے شک وہ کشف کی دوست تھی مگر دل ہی دل میں اسے اپنی بدترین دشمن اور رقیب کی حیثیت سے دیکھتی تھی۔ یہی رقابت ایک دن جنون کی شکل اختیار کرگئی اور کشف کی جان لے گئی۔

وقوعہ کی شام وہ ''آئس'' کے نشے کے زیر اثر کشف کے گھر میں داخل ہوئی۔ اس کے بڑے شولڈر بیگ میں ایک ہتھوڑا نما ہتھوڑی تھی جو اس نے خاص اسی کام کے لیے خریدی تھی۔ گھر میں داخل ہونے کے چار پانچ منٹ بعد ہی اس نے کشف کی جان لے لی۔ بعدازاں واردات کو دوسرا رنگ دینے کے لیے اس نے مقتولہ کے کپڑے پھاڑے اور اس کے جسم پر نوچ کھسوٹ کے نشان ڈالے۔

ثاقب بالکل بے گناہ ثابت ہوا۔ اس کا قصور بس اتنا تھا کہ وہ کشف سے محبت کرتا تھا اور یہ محبت تقریباً یک طرفہ ہی تھی۔ وہ دُلہن بننے والی تھی اور وہ اسے آخری بار دیکھنے اور اس سے ملنے کے لیے اُن کے گھر گیا۔ (وہ جانتا تھا کہ وہ گھر میں اکیلی ہے) وہ مسلسل ڈور بیل بجاتا رہا اور دستک دیتا رہا۔ مگر کشف نے دروازہ نہیں کھولا۔ کھولتی بھی کیسے؟ وہ اپنے ہاتھوں میں خون کی مہندی لگا چکی تھی۔

سکندر بھی اس کیس میں بے گناہ ثابت ہوا مگر دوسرے معاملے میں اُسے بے گناہ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ وہ ایک خاتون کو پامال کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ معاملہ خاتون کا تھا ورنہ میں خود مدعی بن کر اس کے خلاف پرچہ درج کرلیتا۔ بہرحال اپنے دو اعلیٰ افسران کے ساتھ مل کر میں نے اس پر اور اس کے وکیل پر دباؤ ڈالا اور وہ طویل عرصے کے لیے دبئی کی طرف نکل گیا۔

آخر میں، میں اس چھوٹے سے نکتے کی طرف آتا ہوں جس کی وجہ سے دریاب میری نظروں میں مشکوک ٹھہری تھی اور میں نے اس کے خلاف ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ کیا تھا۔

جب میں نے دریاب سے قتل کی شام والی مصروفیات کی تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا کہ وہ شام ساڑھے چھ بجے کے لگ بھگ اپنے والد کی گرے کار ڈرائیو کرتے ہوئے گھر سے نکلی تھی اور افطاری کے بعد آٹھ بجے کے قریب کشف کے گھر پہنچی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ راستے میں کہیں رکی تھی جو اتنی دیر لگی؟ وہ جلدی سے بولی کہ صرف پانچ دس منٹ کے لیے ریگل چوک کے ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں رکی تھی، آئس کریم وغیرہ لینے کے لیے......

یہ آئس کریم والی بات میرے ذہن میں اٹک کر رہ گئی تھی...... یہ بالکل ''کامن سینس'' کی بات ہے کہ جب ہم کسی کے گھر مہمان جاتے ہیں اور میزبان کو پیش کرنے کے لیے آئس کریم لیتے ہیں تو ہماری کوشش ہوتی ہے کہ آئس کریم، میزبان کے گھر کے قریب ہی سے لی جائے تاکہ نرم نہ ہو۔ کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو موسم گرما میں، میزبان کے گھر پہنچنے سے ایک گھنٹا قبل آئس کریم خرید کر رکھ لے مگر یہاں دریاب کی زبان سے بے ساختہ پھسل گیا تھا کہ اس نے آئس کریم ریگل چوک کے قریب سے لی۔ ریگل چوک سے اقبال ٹاؤن کا فاصلہ کم ازکم...... کم ازکم پون گھنٹے کا تھا جبکہ ہر طرح کی آئس کریم بہ آسانی اقبال ٹاؤن کی کسی بھی شاپ سے مل سکتی تھی (یاد رہے کہ دریاب والی گاڑی میں اے سی وغیرہ بھی نہیں تھا) یہی نکتہ دریاب کی گرفتاری کا سبب بنا...... اس کا یہ چھوٹا سا جھوٹ بڑے جھوٹ کا سراغ دے گیا۔

درحقیقت دریاب نے آئس کریم تو کشف کے گھر کے پاس ہی سے خریدی تھی، ریگل چوک کے ڈپارٹمنٹل اسٹور سے اس نے وہ ہتھوڑی لی تھی جو بعدازاں آلۂ قتل ثابت ہوئی اور دریاب سے برآمد بھی ہوئی...... دریاب اب جیل میں اپنے کیے کی سزا بھگت رہی ہے۔

❖❖❖